"اصول فلسفہ وروش ریئالیسم"-چند صفحات کا مطالعہ (5)

Study of a few Pages from: "The Principles of Philosophy and the Methodology of Realism" (5)

Open Access Journal
Qtly. Noor-e-Marfat
eISSN: 2710-3463
pISSN: 2221-1659
www.nooremarfat.com
Note: All Copy Rights are Preserved.

Dr. Abou Hadi
Director Noor Research & Development Pvt (Ltd.); Islamabad.
E-mail: noor.marfat@gmail.com

Abstract:

The article in question is the 5th part of a series of discussions consisting of a study of *Allama Tabataba*'i's book "*Usul Falsafa wa Rowish-e Realism*"; adorned with explanatory notes by Professor *Murtaza Motahari*. In this article, in the light of the words of *Allama Tabataba'i* and Professor Martyr *Murtaza Motahari*, the background history of an ancient Greek school of thought, i.e. Sophism, and its proponents have been examined. Then, the intellectual, philosophical schools of thought like Skepticism and then Idealism are highlighted. After discussing the fundamental differences between the ancient and modern traditions of the philosophical school of Idealism, this paper debunks the fallacy of modern materialists regarding it.

In the next phase, the Realism is introduced in contrast to Sophism, Skepticism and Idealism. Here, it has been examined how Allama Tabatabai and Professor Murtaza Motahari have established proof of human nature in the affirmation of the Realism. Also, the arguments of Berkeley and Schopenhauer, among the leaders of Idealism, have been demystified. And at the end of the paper, a fundamental principle of philosophy, i.e. the principle of "non-contradiction", is explained.

Key words: Sophism, Skepticism, Idealism, Realism.

خلاصہ

پیشِ نظر مقالہ استاد مرتضی مطہری کے تشریحی نوٹس سے مزین، علامہ طباطبائی کی کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کے چند صفحات کے مطالعہ پر مشتمل سلسلۂ بحث کی پانچویں قسط ہے۔ اِس مقالے میں علامہ طباطبائی اور استاد شہید مرتضی مطہری کے کلام کی روشنی میں سب سے پہلے ایک قدیم یونانی فکری مکتب یعنی سوفسطائیت کا تاریخِ پسِ منظر اور اس کے مدعا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اگلے مرحلے میں شکاکیّت اور پھر آئیڈیالزم جیسے فکری، فلسفی مکاتبِ فکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالے میں آئیڈیالزم کے فلسفی مکتب کی قدیم و جدید روایتوں کے اساسی اختلاف کو اجاگر کرنے کے بعد، جدید مادہ پرستوں کے آئیڈیالزم کے حوالے سے مغالطے کو برملا کیا گیا ہے۔

اگلے مرحلے میں سوفسطائیت، شکاکیت اور آئیڈیالزم کے مقابلے میں ریالزم کو پیش کرتے ہوئے اس کا بھرپور تعارف کروایا گیا ہے۔ مقالے کے اس حصے میں یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ علامہ طباطبائی اور شہید استاد مرتضی مطہری نے کس طرح ریالزم کے اثبات میں انسانی فطرت اور فطریات سے برہان قائم کیا ہے۔ نیز آئیڈیالزم کے ناخداوں میں سے برکلے اور شوپنہاور کے دلائل کو راز بھی فاش کیا گیا ہے۔ مقالے کے اختتام پر فلسفہ کے ایک بنیادی اصول یعنی "اصلِ عدم تناقض" کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔

کلیدی کلمات: سوفسطائیت، شکاکیّت، آئیڈیالزم، ریالزم۔

1. تعارف

علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ کی کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کے دوسرے مقالے کا عنوان "فلسفہ اور سفسطہ" ہے۔ دراصل، یہ مقالہ سفسطے اور آئیڈیالزم کے استدلالی ردّ پر مستمل ہے۔ لیکن علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ نے اپنی مخصوص روش اور اختصار کے پیشِ نظر کتاب کے متن میں سفسطے اور آئیڈیالزم کی ماہیت، منشاء اور دلائل بیان نہیں فرمائے۔ اسی طرح انہوں نے اس کتاب میں فلسفے یا ریالزم کا سفسطے اور آئیڈیالزم سے نکتہ امتیاز بھی بیان نہیں فرمایا۔ بنابرایں، کتاب کے محشیٰ، استاد شہید مرتضی مطہری نے اس مقالے پر اپنے تشریحی نوٹس میں سب سے پہلے یہی کام کیا ہے۔ انہوں نے آغازِ کلام میں ان فکری فلسفی مکاتب کی ماہیت اور ان کے باہمی امتیاز پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں شہید مرتضیٰ مطہری کی فرمائشات کا تفصیلی تعارف پیش کیا جارہے ہے۔

2. سوفسطائیت کا بیان

سوفسطائیت کیا ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں دوسرے مقالے کے آغاز میں شہید مرتضیٰ

مطہری نے سوفسطائیت کے سرچشمہ اور اس کی جنم بھومی کا تعارف کروایا ہے۔اس حوالے سے آپ رقمطراز ہیں کہ:

"سقراط کے پیش رَو یونانی دانش مندوں میں سے ایک گروہ کو سوفسٹ Sophist یا سوفسطائی کہا جاتا ہے اور اُن کا نام سوفسٹس کی فہرست میں شامل ہے۔ جس حدّتک تاریخ پر ہماری رسائی ہے، اس کے مطابق، حضرت مسیح علیہ السلام کی میلاد سے پانچ سو سال پہلے یونان میں سفسطہ کی پیدائش ہوئی اور اِس کی پیدائش کے دو عمدہ اسباب تھے:

1. ضد و نقیض اور لوگوں کو حیرت اور تردید میں ڈال دینے والے گونا گوں فلسفی نظریات کا ظہور۔

2. فن خطابت اور بالخصوص عدالتی خطابت کا بے حدّ رواج۔"[1]

شہید مطہری سوفسطائیت کی پیدائش کے اسباب کے تعارف میں اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ما قبل سقراط یونان میں یہ فکری فضا حاکم تھی کہ ایک طرف کئی ایسے فلسفی مکاتب وجود میں آئے جن میں سے ہر ایک جہانِ ہستی کے بارے میں مخصوص نظریہ رکھتا تھا اور دیگر مکاتب کے نظریات کو جھٹلاتا تھا۔ دوسری طرف، یونان کی سرزمین پر ایک تاریخی حادثہ کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان آئے دن مالی تنازعات پیش آتے اور معاملہ عدالت تک جا پہنچتا۔ عدالتوں میں دانش مندوں کا ایک گروہ، وکیلوں کی حیثیت سے حاضرین کے ایک بہت بڑے مجمع میں اپنے موّکلین کا دفاع کرتا اور اُن کے دفاع میں بڑی موئثر تقریر کرتا۔ یہ شعلہ بیان مقرر اپنے موکل کے دفاع میں ہر سیدھے کو الٹا اور ہر الٹے کو سیدھا کر دکھانے کی بھرپور مشق کرتے۔ یہ امر موجب بنا کہ:

"بازارِ خطابت میں اتنی رونق آئی کہ ماہرینِ فن نے باقاعدہ طور پر خطابت کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ خطابت کے اصولوں کی تدریس ہونے لگی اور تعلیم دینے والوں نے اپنے شاگردوں سے باقاعدہ طور پر فیس لینا اور مال و دولت جمع کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ ہر جائز و ناجائز مدعا پر کوئی نہ کوئی دلیل تراش لائیں اور برہان قائم کر دیں۔ایسا بھی ہوتا کہ دو مدّمقابل دعووں میں سے ہر ایک کے لیے کا کوئی نہ کوئی دلیل تراش لی جاتی۔ آہستہ آہستہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ لوگوں کا عقیدہ یہ بننے لگا کہ حق و باطل اور ٹھیک اور غلط نام کی کوئی ایسی مستقل حقیقت وجود نہیں رکھتی کہ جو کبھی لوگوں کی رائے سے مطابقت رکھتی ہو اور کبھی مطابقت نہ رکھتی ہو۔ بلکہ حق وہی ہوتا ہے جسے وکیل حق ثابت کر دے اور باطل وہی ہے جسے وکیل باطل ثابت کر دے۔"[2]

رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات سرایت کر گئی کہ دنیا میں پائی جانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی حقیقت نہیں رکھتی، بلکہ یہ ایک کلی قاعدہ ہے کہ حقیقت انسان کے شعور اور ادراک کے تابع ہے۔اور دنیا میں جو شخص جو ادراک بھی رکھتا ہے، اُس کا وہ ادراک ٹھیک ہے۔ حتی کہ اگر دو شخص [ایک ہی شئے کے بارے میں] دو مختلف فہم رکھتے ہوں تو یہ دونوں فہم ٹھیک ہوتے ہیں۔

اِن عقائد کا پرچار کرنے والے چونکہ اپنے زمانے کے تمام علوم و فنون میں ماہر تھے، لہٰذا انہیں **سوفسٹ**، یعنی "دانش مند" کہا جاتا تھا۔ عربی زبان میں سوفسطائی کا کلمہ (کہ شاید اس کی جگہ "سوفسطی" کا کلمہ صحیح تر ہو) دراصل سوفسٹ سے لیا گیا ہے۔ لیکن بعد میں ہر اس شخص کو سوفسطائی کہا جانے لگا جس نے مذکورہ بالا روش اختیار کی؛ یا دوسرے الفاظ میں جو کسی بھی پائیدار علمی قانون کا پابند نہ ہو۔ اور اس مکتب کو Sophism کہا جانے لگا۔

سوفسطائیوں میں سے ایک معروف سوفسطائی، پروٹاگورس (Protagoras) ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ: **"ہر چیز کا معیار انسان ہے۔"** یعنی ہر شخص جو حکم بھی لگاتا ہے چونکہ اپنے فہم و ادراک کے مطابق یہ حکم لگاتا ہے پس اُس کا حکم، حق ہے؛ کیونکہ "حقیقت" نام ہے انسان کے فہم کا۔ اب چونکہ لوگوں کا ادراک ایک دوسرے سے مختلف ہے، ایک شخص ایک چیز کو ٹھیک سمجھتا ہے، دوسرا غلط اور تیسرا اُس چیز کے ٹھیک یا غلط ہونے کے بارے میں شک و تردّد کا شکار ہو جاتا ہے۔ پس یہ چیز ٹھیک بھی ہے اور غلط بھی، صائب بھی ہے اور خطا بھی۔ ایک اور معروف سوفسطائی، گورگیاس (Gorgias) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے اس بات پر برہان قائم کیا ہے کہ:

> "سب سے پہلے تو محال ہے کوئی چیز تحقق پائے؛ اور اگر کسی چیز کا تحقق پانا ممکن بھی ہو تو اُس کی شناخت ناممکن ہے اور اگر بفرضِ محال کسی چیز کی شناخت ممکن بھی ہو تو کسی فرد کے سامنے اس کی تعریف و توصیف بیان نہیں کی جا سکتی۔ اُس نے ان تینوں دعووں کے دلائل بیان کیے ہیں جو تاریخ فلسفہ کی کتابوں میں گورگیاس کی شرح حال کے ضمن میں مرقوم ہیں۔"[3]

"اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے دوسرے مقالے پر اپنے تشریحی نوٹس میں استاد مطہری مدعی ہیں کہ یونان کی سوفسطائیت سے آکندہ فضا میں وہ لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس فضا کو پاش پاش کیا۔ ان میں سب سے مہم دانشمند سقراط، ارسطو اور افلاطون تھے جنہوں نے سوفسطائیوں کے نظریات کو پوری شدّت سے ٹھکرایا اور ان کے پیش کردہ مغالطوں کی قلعی کھولی اور یہ ثابت کیا کہ لوگوں کے فہم و ادراک سے قطع نظر، حقیقتیں پائی جاتی ہیں، اشیاء حقیقی وجود رکھتی ہیں اور ان میں مخصوص کیفیات پائی جاتی ہیں۔ استاد مرتضیٰ مطہری کے بقول، سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفیوں کا کہنا یہ تھا کہ:

> "حکمت، نام ہے اعیانِ موجودات کے احوال کو ویسا جاننے کا جیسی وہ ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انسان درست طریقے سے سوچ و بیچار سے کام لے تو وہ "حقائق" کا ادراک حاصل کر سکتا ہے۔ ارسطو نے منطق کے قوانین اسی غرض سے تدوین کیے تاکہ انسان فکر میں خطا نہ کرے اور خطا کو صواب سے جدا کیا جا سکے۔"[4]

3. شکاکیّتSkepticism

استاد مطہری کے بقول، یونان میں سوفسطائیت کے ہم سنگ، ایک اور مکتب جو وجود میں آیا وہ شکاکیّت کا مکتب تھا۔ البتہ یہ مکتب ارسطو کے بعد وجود میں آیا۔ دراصل، ارسطو کے بعد کچھ ایسے لوگ آئے جنہیں "لا أَدْرِیُّون" یا شکّاک کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا مکتب شکاکیت یا *Skepticism* کہلایا۔ یہ لوگ سوفسطائی نہیں تھے اور بزعمِ خود انہوں نے ایک درمیانہ راستہ اختیار کیا تھا۔ یعنی انہوں نے نہ تو سوفسطائیت کو اپنایا اور یہ کہا کہ ذہن سے باہر حقیقت نام کی کوئی چیز سرے سے پائی ہی نہیں جاتی اور نہ ہی سقراطیوں کے عقیدے کو اپنایا کہ جن کا کہنا یہ تھا کہ اشیائے عالم واقعی وجود رکھتی ہیں اور بنی نوعِ بشر ان کی وجودی حقیقت کا درست فہم وادراک حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس:

> "اس گروہ کا دعوی یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی ایسا وسیلہ نہیں ہے جس پر اعتماد کرتے ہوئے ہم کسی شئے کے وجود یا عدم کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکیں۔ کیونکہ ہماری حسّ اور عقل دونوں خطا کرتے ہیں۔ فکر کو غلطی سے بچانے کا جو راستہ ارسطو نے اپنی منطق میں بتایا ہے وہ بھی فکر کو خطا سے نہیں بچا سکتا۔ لہٰذا انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ تمام مسائل میں خاموشی اختیار کر لے اور کوئی حتمی رائے نہ دے۔ حتی کہ ریاضی کے ہندسے اور حساب کے مسائل کو بھی ایک احتمال کے طور پر قبول کرنا چاہیے اور انہیں قطعی (حقائق کے) طور پر قبول نہیں کرنا چاہیے۔"

استاد مطہری کے مطابق، مکتبِ شکاکیت کے پیروکار، نہ فقط یونان، بلکہ اسکندریہ میں بھی کافی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے کئی صدیاں بعد تک یہ مکتب رائج رہا۔ اس کے بعد ایک بار پھر انیسویں صدی عیسوی میں چند ایسے فلسفی مکتب وجود میں آئے جو شکاکیت کے مسلک سے کسی حد تک شباہت رکھتے ہیں۔ آئندہ مباحث میں ہم ان فلسفی مکاتب کو بیان کریں گے۔ استاد مطہری مدعی ہیں کہ "سوفسطائیت" اور "شکاکیّت" بعد کے اَدوار کی "آئیڈیالزم" سے کافی شباہت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں، فلسفے یا "ریالزم" کے مدّمقابل قرار پاتے ہیں۔

4. آئیڈیالزم

سوفسطائیّت اور شکاکیّت کا مختصر تعارف کروانے کے بعد استاد مرتضی مطہری نے "اصول فلسفہ وروش ریالیسم" کے دوسرے مقالے کے آغاز میں یہ بھی ضروری جانا ہے کہ یہاں "آئیڈیالزم" اور "ریالزم" کے دو کلمات کے بارے میں بھی کچھ توضیحات پیش کی جائیں۔ کیونکہ اُن کے مطابق، عام طور پر جدید مادّہ پرستوں کی کتابوں میں "آئیڈیالزم" کو "میٹیریالزم" کے مدّمقابل قرار دیا جاتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سب غیر مادی دانش مند، آئیڈیالسٹ ہیں۔ حالانکہ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔

استاد مطہری یہاں انگلش دائرۃالمعارف کے حوالے سے "آئیڈیالزم" اور "ریالزم" کی اصطلاحات کے لفظی اور اصطلاحی معانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آئیڈیالزم کا لفظ، Idea سے نکلا ہے اور یہ لفظ از خود ایک یونانی کلمے Ideo سے نکلا ہے جس کا معنی "دیکھنا" ہے۔ آئیڈیا کا معنی "ظاہر"، "شکل" اور "نمونہ" وغیرہ بھی ہوتا ہے۔ اس کلمے کو بطور فلسفی اصطلاح سب سے پہلے افلاطون نے استعمال کیا۔ افلاطون نے اس کلمے کو اس کے ایک لغوی معنی (نمونہ) میں استعمال کیا۔ دراصل، اُس نے اِس کلمے کو چند ایسے مجرد حقائق کے لیے استعمال کیا جن کا وہ خود قائل تھا، جنہیں آج "افلاطونی مُثُل" یا(Platonic Forms) کا نام دیا جاتا ہے۔

دراصل، افلاطون کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم مادہ کی ہر نوع کے لیے ایک مجرد اور روحانی نمونہ یا مثال پائی جاتی ہے۔ اس کے مطابق انواعِ عالم کے یہ مادی اور محسوس افراد، دراصل، اُس مجرد نمونے اور عقلانی حقیقت کا پَرتو ہیں اور وہ حقیقت اِن محسوس افراد کا کامل نمونہ Perfect Sample ہے۔ افلاطون اس مجرد نمونے کا نام Ideo یا "آئیڈیا" رکھتا ہے۔ مسلمان مترجمین نے Ideo کا ترجمہ، "مثال" کیا ہے اور افلاطونی نمونوں کو "افلاطونی مُثُل" یا (Platonic Forms) کا نام دیا جاتا ہے۔ بنابراین، افلاطون، مادی اور محسوس افراد کے وجود کا منکر نہیں ہے، بلکہ ان کے وجود کو تغییر پذیر، فانی اور جزئی قرار دیتا ہے؛ جبکہ "آئیڈیا" یا "مثال" کے وجود کو کلی، ثابت اور باقی قرار دیتا ہے۔

اپنے تشریحی نوٹس میں استاد مطہری یہ توضیح دیتے ہیں کہ مسلمان فلسفیوں میں سے اشراقیوّں بھی افلاطونی مثل کے قائل تھے۔ منجملہ میر فندرسکی نے اپنے معروف قصیدے میں افلاطونی مُثُل کے عقیدہ کا اظہار یوں کیا ہے:

چرخ با این اختران نغز و خوش و زیباستی　　صورتی در زیر دارد آنچه در بالاستی

صورت زیرین اگر با نردبان معرفت　　بر رود بالا همی با اصل خود یکتاستی

صورت عقلی که بی پایان و جاویدان بود　　با همه و بی همه مجموعه و یکتاستی

این سخن در رمز دانایان پیشین سفته اند　　پی برد در رمزها هر کس که او داناستی

درنیابد این سخن را هیچ فهم ظاهری　　گر ابونصرستی و گر بوعلی سیناستی

یعنی: "آسمان، جو کہ اپنے شفاف اور خوبصورت ستاروں سے مزیّن ہے، اُس کی جو صورت اوپر ہے، ویسی ہی صورت نیچے ہے۔ اگر نیچے کی صورت، معرفت کا زینہ لگا کر اوپر آجائے تو وہ بالکل ویسی ہے جیسی اوپر ہے۔ عقلی صورت جو کہ بے پایان اور جاودانی ہے، سب صورتوں کے ساتھ بھی ہے اور ان سے جدا بھی ہے۔ یہ بات ماضی کے داناؤں نے اپنے سخن میں رمز کی لڑی میں پروئی ہے، لیکن رمز تو وہی سمجھ سکتا ہے جو خود دانا ہو۔ کوئی بھی ظاہری فہم اس بات کو سمجھ نہیں سکتا، خواہ وہ ابو نصر (فارابی) کا فہم ہو یا ابو علی سینا کا فہم۔"[5]

البتہ مسلمان دانشوروں اور فلسفیوں میں سے جس شخصیت نے افلاطونی مثل کے نظریے کی سخت مخالف کی ہے، وہ شیخ الرئیس ابو علی سینا ہیں۔ افلاطونی آئیڈیالزم کی توضیح بیان کرتے ہوئے استاد مرتضی مطہری بتاتے ہیں کہ افلاطون کے مطابق انسان کسی بھی نوعSpecies کے مادی اور محسوس افراد کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اُن کا علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہر نوع کا ہر فرد، ہر آن متغیر ہے۔اور اگر دقیق نظر سے دیکھا جائے تو عین اُسی وقت جب آپ کسی چیز کا حسی ادراک حاصل کرتے ہیں وہ چیز بدل چکی ہوتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے حسی ادراک کے باب میں یہ مقولہ مشہور ہو گیا کہ کسی نے دریا کے پانی کو دوبار نہیں دیکھا۔ استاد مطہری کے مطابق، انواعِ عالم کے مادی اور محسوس افراد کے "علم" کے حصول کے عدمِ امکان پر افلاطون کی دلیل یہ ہے کہ "علم" فقط اُسی چیز کا حاصل کیا جاسکتا ہے جو کلی ہو اور زمان و مکان کے دائرے سے باہر ہو۔ مادی و محسوس افراد چونکہ مکان و زمان کی قید میں پابند ہوتے ہیں اور کلیت کی وصف سے عاری ہوتے ہیں لہٰذا اُن کا علم حاصل نہیں کیا جاسکتا:

"اُس چیز کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے جو کلی ہو اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو اور یہ چیز فقط اور فقط وہی "آئیڈیا" ہے۔"[6]

5. آئیڈیالزم کے معنی میں تبدیلی

استاد مطہری کے مطابق، فلسفے کی تاریخ اسی بات کی گواہی دیتی ہے کہ سترہویں صدی کے اختتام تک "آئیڈیالزم" کا اطلاق *Platonic Forms* پر عقیدہ رکھنے پر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور معنی موجود نہ تھا۔ لیکن بعد میں اس کلمے کے اتنے معانی تراشے گئے کہ بعض کے بقول دنیا کے کسی لفظ نے بھی اتنے معانی نہیں پائے جتنے اس کلمہ نے پائے ہیں۔ بہرصورت، معاصر فلسفی مباحث میں "آئیڈیالزم" کی اصطلاح کا جو معنی رائج ہے اور مادہ پرست بھی اپنی کتابوں میں آئیڈیالزم سے جو معنی مراد لیتے ہیں، اس کے مطابق، "آئیڈیا" یعنی ہر قسم کا ذہنی تصور؛ خواہ یہ تصور حسّی ہو، خیالی ہو یا عقلی ہو۔ اور "آئیڈیالزم" یعنی ان لوگوں کا مکتب جو ذہنی تصوّرات کو اصیلReal سمجھتے ہیں۔ اِس مکتب کے پیروکاروں کے مطابق، ذہنی تصّورات، فقط اور فقط ذہن کی پیداوار قرار ہوتے ہیں اور ان کی پیدائش میں کوئی خارجی موجود یا خارجی حقیقت کارفرما نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں، معاصر فلسفی مباحث میں آئیڈیالزم، عینی حقائق کی ذہنی تصوّرات کی تشکیل میں تاثیر کے انکار کے مترادف ہے۔

یقینا، اس معنی میں آئیڈیالزم، عالمِ خارج کو باطل در باطل قرار دیتا ہے۔ یہ عینی حقائق کے بدیہی ہونے کا منکر ہے؛ جیسا کہ سوفسطائیت بھی بدیہیات کے انکار اور ذہن سے خارج کی دنیا کے وجود کے صریح انکار پر اُستوار ہے۔ لہٰذا استاد مطہری کے بقول، علامہ طباطبائی کی کتاب "اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے دوسرے مقالے میں آئیڈیالزم کا مکتب، سوفسطائیت کے مترادف لیا گیا ہے۔ یہ ریالیزم کے مدّمقابل ہے؛ کیونکہ "ریالزم"، یعنی:

ذہن سے باہر کی دنیا کے وجود کی واقعیّت اور اصالت Reality کا قائل ہونا۔

6. مادہ پرست اور آئیڈیالزم کے معنی میں تحریف

ایک اور نکتہ جس کی طرف استاد مرتضٰی مطہری نے کتاب "اصول فلسفہ وروش رئالیسم" کے دوسرے مقالے کے آغاز میں توجہ دلائی ہے، وہ یہ ہے کہ مادہ پرست، آئیڈیالزم کے تمام معانی بھول کر اُس کا صرف یہی آخری معنی جو کہ سفسطہ کے مترادف ہے، مراد لیتے ہیں۔ وہ اس کلمہ کے معنی میں رونما ہونے والی تاریخی تبدیلیوں اور گوناگوں معانی کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ وہ تغافلِ جاہلانہ کے تحت آئیڈیالزم کے اُس معنی کو نظرانداز کردیتے ہیں جو افلاطون نے مراد لیا۔ بنابریں، مادہ پرست، آئیڈیالزم کے معنی میں تحریف کرتے ہوئے، صرف اِس لفظ کو دستاویز بنا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کسی بڑی فلسفی میراث کے مالک ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ افلاطون، ارسطو، ڈیکارٹ، اور کانٹ وغیرہ نے بھی آئیڈیالزم سے وہ معنی مراد لیا جو مادہ پرست مراد لیتے ہیں۔ اِس مغالطے کے بعد یہ مادہ پرست دعویٰ کرتے ہیں کہ گویا تاریخِ فلسفہ کے سب دانش مند آئیڈیالسٹ تھے۔ افلاطون اور ارسطو کے بارے میں ان کا دعوی یہ ہے کہ یہ یونان کے دو عظیم آئیڈیالسٹ ہیں اور گویا سب سوفسطائیت کے پیروکار ہیں۔ حالانکہ ایسا دعویٰ، تاریخِ فلسفہ کے واضحات کے برخلاف ہے۔

مادہ پرستوں کی اِس شاطرانہ چارہ جوئی کے ایک مثال کے طور یہاں استاد مرتضی مطہری، ایران میں مادہ پرستی کے مکتب کے مروّج، ڈاکٹر تقی ارانی کی ایک ایسی دسیسہ کاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ارانی اپنے "ڈیالیکٹک میٹیریالزم" کے کتابچے میں آئیڈیالزم کی وہی تعریف پیش کرتا ہے جو اوپر گذری۔ وہ جسم کے اولیّہ اور ثانویّہ خواص کے باب میں معروف آئیڈیالسٹ "برکلے" اور ڈیکارٹ کے عقائد، نیز مکان و زمان کے ذہنی ہونے کے بارے میں کانٹ کا عقیدہ بیان کرنے کے بعد اپنی بات کو یوں آگے بڑھاتا ہے:

> "آئیڈیالزم کی تمام اقسام کی توضیح پیش کرنا، ہمارے مقالے کے موضوع سے خارج اور بحث کی طوالت کا سبب بن جائے گا۔ کیونکہ آئیڈیالزم کئی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہے اور ہر فلسفی نے اپنے زعم کے مطابق کچھ نہ کچھ تراشا ہے اور ایک خاص استدلال یا تحقیق پیش کی ہے اور اپنے بقول عالمِ ہستی کے ذہنی ہونے کے اثبات میں ایک نئی دلیل پائی ہے۔"[7]

بہرصورت، استاد مطہری یہاں اپنے قاری پر یہ بات واضح کردیتے ہیں کہ قدیم یونانی افلاطونی روایت میں آئیڈیالزم کا معنی، مُثُل کی اصالت ہے؛ جبکہ مادہ پرستوں کے ہاں آئیڈیالزم کا معنی، تصوّر کا اصالت اور عینی حقائق کا انکار یا کم از کم تصوّرات کی تشکیل میں عینی حقائق کے بنیادی کردار کی نفی ہے۔ معاصر فلسفی ادبیات میں آئیڈیالسٹ وہ ہوتا ہے جو ذہن سے باہر کی دنیا کا منکر ہو؛ جیسے قدیم یونان سے **پرٹوگوراس** اور **گورگیاس** اور یورپ

کے متأخرین میں سے **برکلے** اور **شوپنہاور**۔ جبکہ قدیم فلسفی ادبیات میں آئیڈیالسٹ وہ ہوتا تھا جو تمام مادی انواع کی ایک ملکوتی مثال Form/Sample کا قائل ہو۔

7. ریالزم

استاد مرتضی مطہری نے "اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے دوسرے مقالے کی ابتداء میں "ریالزم" بمقابلہ "آئیڈیالزم" کا بھی مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا ہے۔آپ مستند منابع کی روشنی میں یہ واضح کرتے ہیں کہ "ریالزم" کا کلمہ *Real* سے نکلا ہے جس کا معنی "واقع" یا "واقعی" ہے۔ یہ کلمہ بھی اپنی عمر کی تاریخ میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔آپ ریالزم کے ان معانی میں سے درج ذیل دو اہم معانی بیان کرتے ہیں:

- قرون وسطیٰ میں اصحاب مدرسہ کے ہاں "ریالزم" کا ایک مخصوص معنی مراد لیا جاتا تھا۔ دراصل، مدرسی فلسفے میں یہ بحث انتہائی اہم سمجھی جاتی تھی کہ آیا کلی (مثال کے طور پر انسان کا کلی مفہوم) کا وجود پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کلی کا وجود پایا جاتا ہے تو آیا یہ وجود عالمِ عین میں پایا جاتا ہے یا عالمِ ذہن میں۔ اور آیا کلی عالم خارج میں کوئی مستقل وجود رکھتی ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جن کا عقیدہ یہ تھا کہ کلی اپنے افراد کے قطع نظر، ایک مستقل وجود رکھتی ہے، انہیں واقعیّون یا Realists کہا جاتا تھا۔ لیکن وہ لوگ جو کلی کے عینی وجود کے قائل تھے، نہ ذہنی وجود کے قائل اور کلی کو فقط ایک خالی اور بے معنی لفظ شمار کرتے تھے، انہیں اسمیّون یا Nominalists کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک تیسرا گروہ بھی پایا جاتا تھا جن کا عقیدہ یہ تھا کہ کلی ذہن میں بھی وجود رکھتی ہے اور افراد کے ضمن میں عالم خارج میں بھی وجود رکھتی ہے۔اس گروہ کو تصوّریون یا Idealists کہا جاتا تھا۔
- ریالزم کا دوسرا معنی وہی ہے جو آج کل فلسفی اصطلاح میں رائج ہے، یعنی خارجی واقعیّت کی اصالت کا قائل ہونا۔ ان معنوں میں ریالزم، فقط آئیڈیالزم کے مدّمقابل قرار پاتی ہے جو فقط ذہن یا تصور کی اصالت کی قائل ہے۔ البتہ، آئیڈیالزم اور ریالزم کی اصطلاحات، ادبیات اور لٹریچر میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ادبیات میں ریالزم، اُس طرزِ نگارش پر بولا جاتا ہے جو واقعی اور معاشرتی مظاہر کے تناظر میں لکھی جائے؛ جبکہ آئیڈیالزم یعنی نگارش کا وہ اسلوب جس کی اساس، لکھاری کے محض ذہنی اور شاعرانہ تخیّلات پر ہو۔

8. علامہ طباطبائی اور آئیڈیالزم کا ردّ و ابطال

اپنی کتاب "اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے دوسرے مقالے میں علامہ طباطبائی کا مطمحِ نظر، فلسفی آئیڈیالزم کا ردّ و ابطال ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ:

"ہم میں سے جو شخص بھی اپنے آپ پر اور اپنے ماضی پر ایک نگاہ دوڑائے اور ماضی کے ایام میں لوٹ جائے اور جہاں تک اس کا حافظہ ساتھ دیتا ہو، اپنی زندگی اور اپنے وجود کے گذشتہ ایام کو یاد کرے تو وہ دیکھے گا کہ جس دن سے اُس نے آنکھ کھولی ہے اور اس دنیا کے اچھے یا برے مناظر دیکھتا چلا آرہاہے، اُس نے خود بخود اپنے سے باہر کی چیزوں (عالم خارج) کو پایا ہے اور اس نے اپنی مرضی کے مطابق کئی کام انجام دیے ہیں۔ (البتہ یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ اپنے سے باہر کی چیزوں کے مشاہدے میں ہم نے کئی خطائیں بھی کیں جن کے خطا ہونے کا علم ہمیں اپنے علم و عمل کے ذریعے تدریجی طور پر حاصل ہوا) اور اگر کوئی شخص ماضی کے تجزیے کے اِس عمل کو ایک بار پھر دہرائے اور اپنی زندگی کے ایک ایک طور طریقے کا جائزہ لے تو دوبارہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا (کہ اُس کے وجود سے باہر ایک دنیا ہے جس میں وہ اپنی تمنا کے مطابق کئی کام انجام دیتا ہے)۔"[8]

سابقہ بیان سے علامہ طباطبائی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر فطری طور پر یہ آگاہی اور معرفت پائی جاتی ہے کہ جہاں انسان ہے، وہاں کائنات بھی ہے اور جہاں ذہن ہے، وہاں عینی حقائق بھی پائے جاتے ہیں اور یہ عینی حقائق ہیں جن کا فہم وادراک ہماری ذہنیات اور ہمارے علم کو تشکیل دیتے ہیں۔ پس ہماری یہ فطری معرفت مادی آئیڈیالزم کے اِس دعویٰ پر خطِ بطلان کھینچتی ہے کہ سب کچھ انسان ہے اور انسان سے باہر کی دنیا اور عالمِ خارج، باطل در باطل ہے اور یہ کہ ہمارے تمام ذہنی تصّورات کا منشاء فقط اور فقط ذہن ہی ہے۔

9. فطریات سے کیا مراد ہے؟

علامہ طباطبائی کے مذکورہ بالا بیان اور آئیدیالزم کے ابطال میں استدلال کی وضاحت کے طور پر استاد مرتضیٰ مطہری نے یہاں فطری آگاہی اور فطریات پر ایک تشریحی نوٹ کا اضافہ کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں کہ فطری معلومات یا فطریات کی اصطلاح دو مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے:

"اوّل: وہ معلومات جو بلا واسطہ عقل سے اخذ کی جاتی ہیں اور انسان کی قوت عاقلہ حواس پنجگانہ یا کسی اور چیز کا سہارا لیے بغیر، اپنی طبیعت کے تقاضوں کے مطابق، یہ آگاہی اور معلومات اپنے پاس رکھتی ہے۔۔۔دوّم: بعض اوقات فطریات یا فطری معلومات سے مراد، وہ تسلیم شدہ حقائق لیے جاتے ہیں جن پر تمام اذہان کا اتفاق ہے اور کوئی شخص ان کا انکار یا ان میں شک وتردید نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی زبان سے اُن کا انکار کرے بھی تو میدانِ عمل میں وہ انہیں مانتا ہے۔"[9]

استاد مطہری، فطریات کے مذکورہ بالا دو قسموں کے پسِ منظر میں یہ یاددہانی کرواتے ہیں کہ آئیڈیالزم کے ابطال میں علّامہ طباطبائی نے جس "فطری آگاہی" کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا ہے، اُس سے فطریات کی دوسری قسم،

یعنی "مسلمہ حقائق" مراد ہے۔ کیونکہ پہلے معنی میں فطریات کا وجود، مسلمہ نہیں، بلکہ اختلافی ہے۔ کیونکہ بعض دانش مند پہلے معنی میں فطریات کے وجود رکھنے کے سرے سے منکر ہیں؛ اُن کے مطابق انسان سرے سے اپنے ساتھ کوئی فطری معرفت وآگہی Innate Ideas or Principles of Reasoning لے کر نہیں آتا؛ جیساکہ ارسطو کی طرف اس نظریہ کی نسبت دی جاتی ہے۔ جبکہ افلاطون اور بعد میں ڈیکارٹ فطری معرفت کے قائل ہیں؛ اِس اختلاف کے ساتھ کہ افلاطون کے نزدیک انسان کی تمام معلومات فطری ہیں اور تعلیم وتدریس کا فریضہ بس ان فطری معلومات کی یاد دہانی ہے، جبکہ ڈیکارٹ اور اس کے پیروکاروں کا نظریہ یہ کہ انسان سب معلومات فطری نہیں؛ بعض معلومات فطری ہیں جنہیں انسان پیدائشی طور پر اپنے ہمراہ لاتا ہے۔

10. جدید فلسفی آئیڈیالزم کے ناخدا

آئیڈیالزم کے ابطال پر انسان کی فطری معرفت کی اساس پر، برہان قائم کرنے کے بعد علامہ طباطبائی لکھتے ہیں کہ اِس فطری آگاہی کے ہوتے ہوئے ہمارے لیے یہ بات تعجب آور ہے کہ کچھ لوگ [آئیڈیالسٹس] ذہن سے باہر کی دنیا کی واقعیت کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ بالخصوص جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دعویٰ عام لوگوں کا دعویٰ نہیں، بلکہ ایسے دانشمندوں کا دعویٰ ہے جن میں برکلے (Berkeley) اور شوپنہاور (Schopenhauer) جیسے لوگ شامل ہیں کہ جنہوں نے اپنی ساری زندگی تحقیق اور دنیا کے رازوں کی گتھیاں سلجھانے میں گذار دی۔[10]

یورپی فلسفے کی تاریخ سے آگاہی رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ برکلے اور شوپنہاور کا شمار جدید آئیڈیالزم کی بنیاد رکھنے والے فلسفیوں میں سے ہوتا ہے۔ بنابریں، ضروری تھا کہ ان دونوں یورپی فلسفیوں کی آراء و نظریات کو بیان کیا جاتا۔ لیکن علامہ طباطبائی کے پاس گویا فرصت نہیں تھی کہ وہ اس باب میں قلمفرسائی کرسکیں۔ چنانچہ شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنے تشریحی نوٹس میں یہ خلاء پُر کیا۔ انہوں نے یہاں برکلے اور شوپنہاور پر تفصیلی نوٹس کا اضافہ فرمایا ہے۔ ذیل میں ان فلسفیوں کی بعض آراء کے تعارف میں شہید مطہری کے حواشی بیان ہوئے ہیں[11]:

- **برکلے (Berkeley)**

برطانوی پادری "جارج برکلے" ۱۶۸۵ عیسوی میں پیدا ہوا اور اس نے ۱۷۵۳عیسوی میں وفات پائی۔ اس کی شرح حال اور اس کے نظریات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "برکلے" کا شمار اصحاب حسّ اور *Empiricist* فلاسفرز میں سے ہوتا تھا۔ یعنی وہ حسّ اور تجربے کو تمام علوم کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور ان عقلی اور فطری معلومات کا منکر ہے جن کی یورپ کے فلاسفرز کی ایک جماعت قائل ہے۔ وہ اپنے اس عقیدے میں اپنے ہم عصر برطانوی دانش مند، "جان لاک" کا پیروکار ہے۔ برکلے، اپنے اس عقیدے کے باوجود بھی محسوسات کے لیے کسی خارجی اور

عینی وجود کا قائل نہیں ہے اور خارجی تاثیرات کو احساس کا سرچشمہ قرار نہیں دیتا۔
وہ اپنے اس دعوے پر کہ کسی چیز کا احساس، اس کے خارجی وجود کی دلیل نہیں بن سکتا، حواس کی خطا کو دلیل قرار دیتا ہے۔ البتہ برکلے ذہنی تصوّرات کو حقیقی قرار دیتا ہے اور وہ ان کے حقیقی وجود کا قائل ہے اور وہ اسی امر کو اساس بنا کر نفس کے وجود کو ثابت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ادراک، مُدرِک کے بغیر ناممکن ہے، پس وہ مُدرِک، نفس ہے۔
برکلے یہ عندیہ دیتا ہے کہ وہ اشیاء کے وجود کا منکر نہیں ہے۔ لیکن اس کا کہنا یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں چیز موجود ہے" تو اس جملے پر توجّہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ "میں اس چیز کو موجود سمجھ رہا ہوں۔" مثال کے طور پر اگر ہم یہ کہیں کہ زمین ہے، آسمان ہے، پہاڑ ہے، دریا ہے، یا یہ کہیں کہ سورج روشن ہے، جسم حجم رکھتا ہے، اور زمین گردش کرتی ہے تو یہ ساری باتیں صحیح ہیں۔ لیکن اگر ہم ان جملات کے معنی کی حقیقت کو کھولیں تو وہ یہ ہے کہ "ہمیں یوں لگتا ہے کہ زمین ہے، آسمان ہے، پہاڑ ہے، دریا ہے، یا یہ کہیں کہ سورج روشن ہے، جسم حجم رکھتا ہے، اور زمین گردش کرتی ہے۔" پس کسی شئے کا وجود رکھنا، مساوی ہے اس شئے کے کسی مُدرِک کے ادراک میں پائے جانے سے (خواہ عالم عین میں وہ شئے پائی جاتی ہو یا نہ پائی جاتی ہو)۔
برکلے کا دعوی یہ ہے کہ میں سوفسطائی نہیں ہوں کیونکہ میں موجودات کے وجود کا منکر نہیں۔ لیکن وہ موجود ہونے کا ایک ایسا معنی پیش کرتا ہے جو دوسروں کے ہاں مقصود نہیں ہے۔ اس کے نزدیک وجود رکھنا، مساوی ہے مُدرِک کے ادراک میں پائے جانے سے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، برکلے، حسّ کو علم کا سرچشمہ قرار دیتا ہے، لیکن حسّ کا سرچشمہ، خارجی چیز کے وجود کو قرار نہیں دیتا، وہ نفس کے وجود کا قائل ہے اور خدا کے وجود کا بھی قائل ہے۔ وہ خدا کی ذات کے اثبات میں یوں استدلال پیش کرتا ہے:
"چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف محسوسات کی صورتیں، ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ ہمارے ذہن میں وجود پاتی اور محو ہو جاتی ہیں اور ان کا یہ آنا جانا ہمارے نفس کے اختیار سے باہر ہے۔ مثال کے طور پر ہم بعض اوقات دن کا احساس کرتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ عین اسی وقت جب ہم یہ محسوس کر رہے ہوں کہ ابھی دن ہے، یہ بھی محسوس کر سکیں کہ اب رات ہے، اور فقط کئی گھنٹے گذر جانے کے بعد ہی یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اب رات ہے اور جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب رات ہے، تو اُس وقت یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ اب دن ہے۔ ہمارے دیکھے یا سنے جانے والے دیگر محسوسات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی اور ذات ہے جو ایک خاص نظم و ضبط سے ہمارے ذہن میں ان محسوسات کا ادراک و احساس اجاگر کرتی ہے اور وہ ذات، خدا کی ذات ہے۔"

- **شوپنہاور Schopenhauer**

شوپنہاور، ایک مشہور جرمن فلسفی ہے جو ۱۷۸۸ عیسوی میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۰ عیسوی میں وفات پائی۔ شوپنہاور،

دنیاکے بارے میں بدبین لوگوں کا سربراہ شمار ہوتا ہے اور وہ زندگی کو سراسر رنج والم اور دنیا کو ایک ماتم کدہ اور غم خانہ قرار دیتا ہے۔ اس نے تقریباساری زندگی گوشۂ عزلت میں گذار دی اور عمر بھر شادی نہ کی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شوپنہاور بچپن ہی سے توہّمات کا شکار اور خوف وہراس میں مبتلا تھا اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈرتا تھا۔ مثال کے طور پر رات کو معمولی سی آواز پر نیند سے بیدار ہو جاتا اور اپنا پسٹل اٹھالیتا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ دنیاکے بارے میں یہ بدبینی، شوپنہاور نے اپنے اجداد سے ورثہ میں پائی اور اس کا باپ بھی جو کہ ایک تاجر تھا، ہمیشہ افسردہ خاطر اور ملول رہتا اور اس نے آخرکار خودکشی کرلی تھی۔

شوپنہاور نے اپنی زندگی میں کئی ناخوشگواریوں اور محرومیوں کا سامنا کیا اس کی زندگی میں کسی نے اس کی کتابوں اور مکتوبات پر توجّہ نہ دی۔ شوپنہاور نے فیصلہ کیا کہ برلن یونیورسٹی میں فلسفے کی تدریس شروع کرے لیکن جو مضمون وہ پڑھانا چاہتا تھا، اس میں تین نالائق طالب علموں کے علاوہ کسی اور نے داخلہ ہی نہ لیا۔ آخرکار وہ مجبور ہوا کہ اپنی معلومات اور افکار، ایک ہمسایہ درزی خاتون کو منتقل کرے۔ لیکن اس مباحثے کا انجام بھی باہمی جھگڑے کی صورت میں نکلا۔ اس عورت نے کورٹ میں شوپنہاور کے خلاف مقدمہ دائر کردیا اور کورٹ نے بھی شوپنہاور کو ہمسایہ عورت کو مارپیٹ کے جرم میں جرمانہ کردیا۔

شوپنہاور، ڈیکارٹ اور اس کے پیروکاروں کے برعکس، عقل سے سرچشمہ پانے والے تصوّرات اور معلومات پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ لٰہذا وہ تمام تصوّرات اور تمام علوم کا سرچشمہ، حسّ کو قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک عقل کا کام تو بس حسّ کی جانب سے مہیا کردہ مواد میں تصرف ہی ہے۔ شوپنہاور کا شمار اس لیے مادّہ پرستوں میں سے ہوتا ہے کیونکہ وہ تمام معلومات کو غیر حقیقی قرار دیتا ہے اور اس کے ہاں وہ دنیا جس کا ادراک انسان حسّ وشعور اور عقل سے کرتا ہے، جہانِ مادہ ہے اور جہانِ مادہ فقط اور فقط ذہنی اور نمائشی ہے۔ وہ معروف پادری برکلے کے برعکس، ادراک اور قوۂ مدرکہ کی حقیقت کا منکر ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود شوپنہاور ایک چیز کو حقیقی قرار دیتا ہے اور وہ چیز "ارادہ" ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا کی حقیقت، ارادے سے عبارت ہے اور انسان اپنی حقیقت کو جو کہ اس کا ارادہ ہی ہے، حسّ اور عقل کی مدد کے بغیر درک کرسکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ارادہ، اپنی ذات میں ایک مطلق، مستقل اور زمان ومکان کی قید سے آزاد حقیقت ہے اور دنیاکے تمام حقائق، دراصل ارادے کے درجات ومراتب ہی کا نام ہیں۔ بنابرایں، اگرچہ شوپنہاور، معلومات کی دنیا کو فاقدِ حقیقت قرار دیتا ہے اور اس لحاظ سے وہ ایک آئیڈیالسٹ شمار ہوتا ہے، لیکن وہ ایک ایسی حقیقی دنیا کا قائل بھی ہے جو معلومات کی دنیا سے ماوراٴ اور حسّ وشعور اور عقل کے ذریعے قابلِ درک نہیں ہے اور یہ دنیا، "ارادے" کی دنیا ہے۔ لٰہذا شوپنہاور کو اس لحاظ سے ریالسٹ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

شوپنہاور، اپنے اسی فلسفی اصول کو بنیاد بنا کر زندگی، لذّت، عشق اور عورت کے باب میں مخصوص عقائد کا قائل

ہو جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ارادہ، جو کہ دنیا کی اصل واساس ہے اور واحد ہے، شر و فساد کا موجب ہے۔ کیونکہ ارادہ جونہی عالم کثرت میں قدم رکھتا ہے، سب سے پہلی چیز جسے وہ چاہتا ہے، زندگی کی بقا اور اس کا تسلسل ہے اور جب ایسا ہے تو پھر نہ چاہتے ہوئے بھی، انسانوں کے اندر خود خواہی اور خود پرستی کے جذبات پنپنے لگتے ہیں اور اِن خود خواہیوں کی وجہ سے لوگوں کے درمیان تصادم پیدا ہوتا ہے جس سے باہمی جھگڑے، کشمکش اور شر و فساد ایجاد ہوتا ہے۔

شوپنہاور کا کہنا ہے کہ لذّت ایک عدمی چیز اور درد ایک وجودی چیز ہے۔ اور دو جنس مخالف (مرد اور عورت) کا عشق ہی سب بدبختیوں کا آغاز ہے۔ اور اس عشق کی حقیقت، زندگی کا یہی ارادہ ہی تو ہے کہ وہ چاہتی ہے اپنی نسل کو دوام بخشے۔ ہاں! محض اس لیے کہ انسان زندگی کی سختیاں جھیلنے پر تیار ہو جائیں، طبیعت انہیں دھوکہ دیتی ہے اور جھوٹی لذّتوں سے ان کا دل بہلاتی ہے۔

اُس کا کہنا ہے کہ عاشق اور معشوق کا اپنے عشق لوگوں سے چھپانے کی کوشش کرنا اور ہزاروں احتیاطوں کے ساتھ آپس میں نظریں لڑانا، اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ زندگی اوّل تا آخر بدبختی ہے اور عاشق و معشوق یہ چاہتے ہیں کہ نسل کو استمرار دے کر اس بدبختی کو جاری رکھیں اور یوں گویا ایک بہت بڑی جنایت کا ارتکاب کریں اور واضح سی بات ہے کہ اگر ان کا یہ عشق نہ ہوتا تو دنیا کا اختتام ہو جاتا اور عالم ہستی کے مصائب کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔

شوپنہاور "بودا" کے فلسفہ پر کامل یقین رکھتا تھا اور اس کے نزدیک انسان کی حقیقی سعادت، نفس کی ریاضت اور جینے کی تمنا چھوڑ دینے اور خاص طور پر عورتوں سے آمیزش کے ترک میں ہے؛ تاکہ انسانی نسل منقطع ہو جائے اور یوں ہر طرف سکون و آرام حاکم ہو جائے۔

11. برکلے اور شوپنہاور کی بھونڈی منطق

علامہ طباطبائی نے اپنی کتاب "اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے دوسرے مقالے میں برکلے (Berkeley) اور شوپنہاور (Schopenhauer) کی نام نہاد آئیڈیالزم کے بے پایہ و اساس ہونے کو خود ان لوگوں کی عملی زندگی سے ثابت کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

> "اگر ہم تھوڑے صبر سے برکلے اور شوپنہاور جیسے لوگوں کی بائیو گرافی کا جائزہ لیں اور ان کی زندگی میں تھوڑا سا غور و فکر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی مادر زاد سوفسطائی پیدا نہیں ہوا۔ کسی نے سفسطے کے ساتھ زبان نہیں کھولی اور نہ ہی کبھی ایسا ہوا کہ انہوں نے اپنی "ادراک و ارادہ" کی فطرت گنوادی ہو اور ہنسنے کی بجائے روئے یا رونے کی جگہ ہنسے ہوں۔ یا حتی کہ زندگی میں ایک بار انہوں نے سننے کے لیے کانوں کی بجائے آنکھیں استعمال کی ہوں اور دیکھنے کی

چیزوں کا ادراک حاصل کرنے کے لیے کان استعمال کیے ہوں۔ یا نیند پوری کرنے کے لیے کھانا کھایا ہو اور بھوک مٹانے کی غرض سے سوئے ہوں۔ یا بات کرنے کے لیے منہ بند کیا ہو اور چپ سادھنے کے لیے یاوہ گوئی کے مرتکب ہوئے ہوں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ انہوں نے بھی بالکل ہماری (ریالسٹس) طرح اسی نظام کے تحت زندگی گذاری جو انسانی زندگی پر حاکم ہے اور وہ نوع انسانی کے انسانی اور ارادی افعال میں ہم سب کے ساتھ شریک رہے ہیں۔" [12]

اس بیان سے علامہ طباطبائی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ برکلی اور شوپنہاور سمیت، تمام آئیڈیالسٹس اس حقیقت میں ہمارے ساتھ شریک ہیں جس کا ہم نے ابتدائے سخن میں تذکرہ کیا ہے۔ یعنی یہ حقیقت کہ انسان کے باطن اور وجود سے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ اور انسان کے مقابلے میں کائنات کا وجود حقیقی ہے۔ بنابرایں، آئیڈیالسٹس کی عملی زندگی، ریالزم کی زندگی ہے اور وہ ریالسٹس کے ساتھ اُن تمام علوم و معلومات میں شریک ہیں جو ریالزم کے اصول اولیہ تشکیل دیتے ہیں۔ یہ لوگ انہی ادراکات کے حامل ہیں جن کے ریالسٹ حامل ہیں اور وہ بھی وہی ابتدائی افعال انجام دیتے ہیں جو ریالسٹ انجام دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آئیڈیالزم اور سفسطہ کے ناخداوں کا یہ دعویٰ کہ: "کوئی واقعیت وجود نہیں رکھتی"، ایک غیر منطقی اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔

مذکورہ بیان میں علامہ طباطبائی نے ریالزم کے جن اصول اّلیہ کی بات کی ہے، استاد مطہری ان کو وضاحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان سے مراد وہ ابتدائی بشری آگہی اور معلومات ہیں جنہیں علمِ منطق کی زبان میں تحلیل و ترکیب کی بحث میں "مبادی تصوریّہ" اور "مبادی تصدیقیّہ" کا نام دیا جاتا ہے اور برہان کے باب میں انہیں "ضروریات" اور "بدیہیات" کا نام دیا جاتا ہے۔

12. آئیڈیالزم کی تناقض گوئی

آئیڈیالزم کے ابطال میں علامہ طباطبائی کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ مکتب تناقض گوئی کا شکار ہے کیونکہ بذاتِ خود یہ دعویٰ کہ: "کوئی واقعیت وجود نہیں رکھتی" اپنے اندر کئی واقعیتوں کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ علامہ کے بقول:

"جونہی یہ لوگ زبان کھولتے اور تفہیم و تفہم کے درپے ہوتے ہیں، درحقیقت بہت سی معلومات کی صداقت کی گواہی دے رہے ہوتے ہیں۔ (مثال کے طور پر یہ کہ کوئی متکلم ہے، کوئی مخاطب ہے، کلام ہے، دلالت ہے، ارادہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور آخرکار تاثیر ہے، علیت و معلولیتِ مطلق ہے)۔ اِن حقائق میں سے کسی ایک حقیقت کا اعتراف بھی اہل سفسطہ کو مات دینے کے لیے کافی ہے۔" [13]

یہی وجہ ہے کہ آپ کے بقول، جب آئیڈیالزم کے پیروکاروں اور پرچار کرنے والوں نے دیکھا کہ اسی ایک جملے میں کئی واقعیتیں پوشیدہ ہیں تو انہوں نے جملے کی صورت اور ترکیب بدل دی اور کہا کہ: "ہمیں واقعیت کا علم نہیں

ہے۔" اور بعض نے جب دیکھا کہ خود اس جملے میں بھی کم از کم "علم" نامی ایک حقیقت کا اعتراف موجود ہے تو انہوں نے بزعمِ خود بات کو مزید دقیق بناتے ہوئے کہا کہ: "ہم، اپنے وجود سے باہر کوئی واقعیت نہیں پاتے۔" بعض نے کہا کہ: "میں اپنے اور اپنے افکار کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔" لیکن اِن سب سے خطرناک بات وہ لوگ کہہ گئے جنہوں نے بطور مطلق حقیقت اور بالخصوص اپنی حقیقت کا بھی انکار کر دیا۔ یہاں سے پتہ چلا کہ سفسطے کی حقیقت، علم (واقعیت کے مطابق ادراک) کا انکار ہے۔ان لوگوں کے دلائل بھی اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔[14]

آئیڈیالزم کی اس متناقض منطق کی طرف رہنمائی کرنے کے بعد علامہ طباطبائی مدعی ہیں کہ آئیڈیالزم اور سفسطہ کی اساس، درحقیقت، تناقض کے اصول کے انکار پر رکھی گئی ہے۔دوسرے الفاظ میں، آئیڈیالزم گویا مدعی ہے کہ وجود اور عدم کے درمیان کوئی تناقض نہیں ہے۔آئیڈیالسٹس تنہا اسی بنیاد پر واقعیت کا انکار کر سکتے ہیں وگرنہ وجود و عدم کے درمیان، انسان اور لاانسان اور ہستی و نیستی کے درمیان تناقض کو اگر ایک مسلمہ اصول کے طور پر مان لیا جائے تو پھر کسی حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر اِس اصول کو ٹھکرا دیا جائے تو بڑی سے بڑی اور روشن سے روشن تر حقیقت کو بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

13. تناقض محال ہے

یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص مان لے کہ وہ آنِ واحد میں وجود بھی رکھتا ہے اور نابود بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وجود و عدم اور ہستی و نیستی کے درمیان تناقض کا اصول، ایک ایسی فطری معرفت اور آگہی ہے جو ہر باشعور انسان جانتا ہے۔ جب تک انسان اس اصول کا معترف رہے، وہ آئیڈیالزم کی تائید نہیں کر سکتا؛ کیونکہ آئیڈیالزم اپنی نہائی سوچ میں یہاں پہنچتی ہے کہ وجود و عدم کے درمیان تناقض محال نہیں ہے۔

اس کے باوجود آئیدیالسٹوں اور ڈیالیکٹک میٹیریالزم کے فلسفیوں نے "ضدین کی وحدت" کا قانون پاس کر لیا ہے اور استاد مطہری کے مطابق، وہ اِسے "اصلِ عدمِ تناقض" کے قانون پر خطِ بطلان قرار دیتے ہیں۔ لیکن "ضدین کی وحدت" کا قانون چونکہ غیر فطری ہے، لہٰذا اسے اساس قرار دے کر کسی قابل قبول Justified فکری، فلسفی مکتب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈیکارٹ نے چاہا کہ "عدمِ تناقض" کے اصول کو مسترد کر کے ایک نئی بنیاد ڈالے تو سرانجام، اُسے اپنا موقف بدلنا پڑا۔ دیکارٹ کی اِس فکری کاوش کے حوالے سے استاد مرتضیٰ مطہری رقمطراز ہیں کہ:

> "یہاں جس نکتے کی یاد دہانی بے سود نہیں ہے وہ یہ ہے کہ معروف فرانسوی فلسفی ڈیکارٹ نے جب یہ چاہا کہ اپنی تمام معلومات پر نظرِ ثانی کرے اور ایک نئی بنیاد ڈالے تو اُس نے اپنے تمام محسوسات، معقولات اور منقولات پر شک کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ شاید جس طرح میں محسوس کرتا ہوں،

یا سوچتا ہوں یا مجھے بتایا گیا ہے، ایسا نہ ہو اور میری سب معلومات بالکل اسی طرح ایک باطل خیال ہوں جس طرح خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا، سوچتا ہے، باطل ہوتا ہے۔"[15]

گویا ڈیکارٹ نے لمحہ بھر کے لیے اپنے تمام علوم وافکار کو باطل قرار دے دیا۔ لیکن ایسے کرنے کے بعد ڈیکارٹ کو خیال آیا کہ اگرچہ وہ ہر چیز میں شک وتردید ایجاد کر سکتا ہے، لیکن بذاتِ خود تردید اور سوچ کے واقعی ہونے میں کوئی شک وتردید ایجاد نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس نے اعتراف کیا کہ وہ اپنی سوچ کی حقیقت Reality میں شک نہیں کر سکتا۔ تب اُس نے اسی سوچ کو سوچنے والے کے وجود پر دلیل قرار دیا اور اپنے وجود کے واقعی ہونے پر مطمئن ہوا اور کہا کہ: "Cogito, ergo Sum" یعنی: "میں سوچتا ہوں، پس میں ہوں۔" اور یوں ڈیکارٹ نے اسی اصول کو اپنے پورے فلسفی نظام کی بنیاد قرار دیا۔

14. ڈیکارٹ اور عدمِ تناقض کا اصول

شہید مرتضیٰ مطہری نے یہاں ڈیکارٹ کے فلسفی تاملات اور اس کے بنیادی فلسفی اصول کے نقل کے بعد، اُس پر ہونے والی تنقید کا ایک انتہائی اجمالی جائزہ لیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ڈیکارٹ کے بعد کئی دانشمندوں نے اُس کے اِس استدلال پر بہت سے اعتراضات اٹھائے۔ لیکن ہم فی الحال وہ اعتراضات بیان نہیں کرنا چاہتے اور فقط ایک ایسا اعتراض بیان کریں گے جو ہماری بحث سے مربوط ہے اور ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی اور نے ڈیکارٹ پر یہ اعتراض کیا ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ اگر انسان اس قانون (عدم تناقض کا قانون) کو ٹھکرا دے تو یہ نتیجہ نہیں لے سکتا کہ: "میں سوچتا ہوں، پس ہوں۔" کیونکہ اگر تناقض محال نہ ہو تو یہ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں سوچتا بھی ہوں اور نہیں بھی سوچتا۔ نیز یہ کہنا بھی مجاز ہوگا کہ میں وجود بھی رکھتا ہوں، لیکن میں نابود بھی ہوں۔ بنابرایں، حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم اور تمام ادراکات کی اساس ہے یہ ہے کہ وجود و عدم اور ہستی و نیستی کے درمیان تناقض محال ہے اور "عدم تناقض" کا قانون، ایک مسلمہ اور فطری قانون ہے۔ لیکن اگر اس فطری اصول کو نظرانداز کر دیا جائے تو پھر کسی بھی علم کو بنیاد فراہم نہیں کی جا سکتی۔

*****

References

1 . Allama Syed Muhammad Hussain Tabatabaie, *Usool-e Falsafa wa Rawish-e Realism*, Vol. 1 (Tehran, *Intesharat-e Sadra*, 1393 SH.), 55-56.

علامہ سید محمد حسین طباطبائی، *اصول فلسفہ وروش رئالیسم*، جلد 1 (تہران، *انتشارات صدرا*، 1393 ش)، 55-56۔

2. Ibid, 56.

ایضاً، 56۔

3. Ibid, 57.

ایضاً، 57۔

4. Ibid.

ایضا۔

5. Ibid, 59.

ایضاً، 59۔

6. Ibid.

ایضاً۔

7. Ibid, 60.

ایضاً، 60۔

8. Ibid, 55.

ایضاً، 55۔

9. Ibid, 62.

ایضاً، 62۔

10. Ibid.

ایضاً۔

11. Ibid, 62-66.

ایضاً، 62-66۔

12. Ibid, 63-65.

ایضاً، 63-65۔

13. Ibid, 68.

ایضاً، 68۔

14. Ibid, 66.

ایضاً، 66۔

15. Ibid, 67.

ایضاً، 67۔